IQBAL REVIEW (65: 4)
(October - December 2024)
ISSN: P0021-0773
ISSN: E3006-9130

اقبال کے تعلیمی افکار اور جدید سائنسی علوم

خواجہ غلام رسول
پراجیکٹ مینیجر، لوکل محکمہ بلدیات و دیہی ترقی
آزاد جموں اینڈ کشمیر

ABSTRACT

In the stream of human faculties, there always have been the personalities who shape the face of human history, civilization and intellectual treads. In modern Muslim era, Allama Iqbal is one of the personalities who is still considered at the top of educational, intellectual, philosophical and pyramid of resurrection of Muslim Ummah. There are many certain and dynamics concepts of Iqbal about different domains of humanistic epoch of development. But to review, resurrect and apply the educational concepts of Iqbal, is dire need of the era. Because the roots of total and every sort of development rely upon the profound basis of education. In this epitaph, the educational concepts of Iqbal covers different aspects of modern scientific education, its limitations, implications, status of different subjects in the realm of Islamic directives, education of women, noumenal futuristic horizons of education and practical endeavors for educational betterment of Ummah with contemporary applications explained precisely. The objectives of research are to explore the dynamic

educational concepts of Iqbal and to articulate their contemporary importance and applications. The question(s) of research enquires the crux of Educational Philosophy of Iqbal and its application. Data collection and analysis was done, in accordance with the rules of qualitative research and discourse analysis. Conclusion/results are derived while employing the multi-facet technique of analysis. Major findings are summarized as that the educational concepts of Iqbal have their importance and relevance up to date. The revival needs the application of Iqbal's educational formulations.

Keywords: Allama Iqbal, Educational Concepts, Modern Scientific Knowledge, Way forward

ابتدائے کائنات کے حادثے کو وقوع پذیر ہوئے صدیاں بیت گئی۔ اس کائنات زیریں کی وسعتوں کے سائنسی مفروضوں اور مشاہدات کے جائزے سے معلوم ہوا کہ نظام شمسی اور ہماری زمین کا حجم کائنات کے مقابلے میں حقیر ترین حد سے بھی چھوٹا اور کم ترین ہے۔ اس طرح حضرت انسان کا کائنات سے تقابل کا خیال احمقانہ محسوس ہوتا ہے۔ اس کثیر الکائناتی بے پناہ اور لا متناہی وسعتوں کی سکیم (منصوبے) میں انسان کے وجود کا ظہور مہمل اور لایعنی معلوم ہوتا ہے۔ جب اس خلائے بسیط و فضائے لا محدود میں انسان کا بشریاتی، جغرافیائی، تاریخی، تہذیبی، تمدنی، لسانی اور دیگر پہلوؤں سے مطالعہ و مشاہدہ کیا جاتا ہے تو عصر حاضر تک کی تمام تر تحقیقات کے متفقہ نتائج اس بات کا اعادہ کرتے ہیں کہ انسان کے علاوہ، انسانی طرز کی منطقی و شعوری مخلوق کا سراغ کہیں کسی گوشۂ کائنات میں فی الحال میسر نہیں آیا۔ یہ معلومات انسان کی بے ثباتی کے باوجود اس کی ڈھارس بندھواتی ہے۔ سائنس و مذہبی مطالعے سے انسان کی تخلیق کا مرحلہ بھی بہت عجیب اور بے حیثیت معلوم ہوتا ہے۔ "صاحبانِ علم و حکمت" انسانی تخلیق کے واقعہ کو حادثاتی گردانتے ہیں اور اس کے آغازِ حیات کو ایک خلیئے کے بھی کئی جزوی حصوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ کائنات میں انسان کے سوا غایتِ تخلیق کا کوئی اور پہلو اور شاہکار معلوم نہیں ہوتا۔ آب و گل کے وسیع میدان میں مدتوں "احسن تقویم" کی آرائشیں ہوتی رہیں۔ بالاخر خدائے ذوالجلال کے عظیم شاہکار حضرت انسان کا ظہور ہوا ہے۔ مذہبی تاریخ میں قصہ آدمؑ و ابلیس وقوع پذیر ہوا۔ حضرت آدم کو علم کی بنا پر مخلوقاتِ عالمین پر فضیلت عطا ہوئی۔ خلافت ارض و سماء کا تاج اس کے سر پر رکھا گیا۔ ساکنانِ

عرشِ اعظم کی تمناؤں کا خوں ہوا۔ اسی تسلسل کے تحت زمانوں نے انسانوں میں گنتی شروع کی۔ پیغمبرانِ عظیم المرتبتؑ کا تسلسل بھی جاری ہوا۔ جسداً جسداً فطری و ربانی قوانین نازل ہوتے گئے۔ ضروریاتِ عصر کے مطابق احکامات نازل اور ترمیم و تدوین کے مرحلے سے گزرتے گئے۔ بالاخر اس تسلسل کی آخری برگزیدہ ترین شخصیت حضرتؐ محمد ﷺ کا ظہور مبارک ہوا۔ تمام پیغمبرانؑ کو مختلف القابات اور پیشوں کے ساتھ منسلک کیا گیا۔ لیکن نبی آخر الزماںؐ نے امی لقب پایا اور فرمایا کہ مجھے معلم بنا کر مبعوث کیا گیا ہے۔ عالمین کے اس عظیم ترین معلم نے آفاقی دین کی تبلیغ و اشاعت کا سلسلہ شروع کیا۔ پیغمبرانؑ ذی وقار کی تاریخ میں یہ واحد ذات گرامی تھی کہ جن کی تبلیغ کا دائرہ صرف اپنی قوم تک محدود نہ تھا بلکہ فرزندانِ توحید، اس پیغام کو لے کر دنیا میں پھیل گئے۔ وہ جہاں بھی گئے اپنے علم و کردار کی عظمت کی بدولت دلوں کی دنیا تسخیر کرتے گئے۔ دنیائے عالم جو بت کدہ کی شکل اختیار کر چکی تھی۔ دین ابراہیمی ہو یا اہل کتاب کا مذہب، بدھ ازم ہو یا دیگر کوئی مذہب، ہر گاہ شخصیت سے مظاہر پرستی تک کا دور دورہ تھا۔ انسان اپنی فکری ذلت میں اس حد تک گر چکا تھا کہ وہ اپنے گردونواح کی گھٹیا ترین اشیاء کے سامنے بھی اپنی جبین نیاز جھکا لیتا تھا۔ ایسی صورت حال میں مسلمانوں نے دنیا میں اس پیغام کو پھیلایا کہ کائنات، مظاہر کائنات و مافیہا پوجنے کی نہیں برتنے کی شے ہے۔ اس طرح عمومی و عالمی سطح پر نظریہ توحید کو جانا اور مانا گیا۔ بقول علامہ اقبال:

نہ تو زمیں کے لیے ہے نہ آسماں کے لیے
یہ جہاں ہے تیرے لیے، تو نہیں جہاں کے لیے[1]

یہ عقیدہ توحید کا ہلکا سا ثمر تھا کہ تقدیس کے لبادے میں ملبوس، مظاہر و تصورات کو عملی طور پر کاملاً نہ سہی فکری اعتبار سے کھنگالا گیا۔ اس طرح فرزندانِ توحید کی تعلیمات کے باعث بڑی سطح پر فکری مہیج میسر آئی کہ جس کی بدولت "تحقیق و تنقید" کو باقاعدہ ضابطِ علوم میں شامل کیا گیا۔ ذات سے لے کر کائنات تک ہر شے پر غور و فکر اور تحقیق شروع ہوئی۔ اس طرح ہمہ گیر قسم کے سائنسی و عمرانی علوم پروان چڑھے۔ وگرنہ یہ کیسے ممکن تھا کہ جو لوگ کسی شے / مظہر کو دیوتا / خدا سمجھتے اس پر تحقیق کرتے ،اس کی جراحی کرتے؟۔ یہ عقیدہ توحید کا ہی خاصہ تھا کہ اس نے انسان کو ان تمام ذلتوں سے آزاد کرتے ہوئے عزت و توقیر سے سرفراز کیا۔ علامہ اقبال نے اس نکتہ کو اس طرح بیان کیا ہے:

یہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات[2]

پھر کیا تھا کے ہر شعبہ حیات میں مسلمان ترقی کی بلند سطح تک پہنچے۔ مغرب میں جب عہد جہالت (Dark ages) کا عرصہ تھا، مسلم تہذیب اس وقت دینی و دنیوی ترقی کے زینے طے کر رہی تھی اور اپنی درخشانی و تابانی کی بدولت پوری دنیا میں اس کا چرچا تھا۔ علم و معرفت، سائنس و ٹیکنالوجی، عمرانی علوم، فلسفہ و حکمت، ریاضی و منطق، طب و علمِ نجوم غرض کہ ہر شعبہ علم میں مسلمان لاشریک تصور ہوتے تھے۔ اس فضیلت کی گواہی غیر بھی دیتے تھے۔ مرورِ زمانہ کے ساتھ ساتھ، طریقِ حکومت اور دیگر نظم ہائے حیات میں تنزلی کی بدولت مسلمان قنوطیت پسند، پابندِ تقدیر اور عمل گریز ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ اہل مغرب انہی علوم کی تحصیل کر کے اپنی زبانوں میں منتقل کرتے گئے۔ پھر چشمِ فلک داناو پیر نے وہ دن بھی دیکھے کہ جب "صاحبان عہد جہالت" احیائے علوم کی تحریکوں سے بہرہ ور ہو کر، علم و حکمت کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی پر مامور ہو گئے، اور "صاحبان علم و شعور" اپنی کم مائیگی اور کج فہمی کی بدولت مائل بہ جہل ہوتے گئے۔ اس طرح نتیجتاً یہ ناگفتہ بہ حالت ان کا مقدر ٹھہری۔ اس انتقالِ علوم پہ علامہ اقبال نے اس طرح کلام کیا ہے:

مگر وہ علم کے موتی، کتابیں اپنے آباء کی
جو دیکھیں ان کو یورپ میں، تو دل ہوتا ہے سیپارا[۳]

علامہ محمد اقبال مغرب کی حالیہ ترقی کو اسلامی فہم کی ہی ترقی یافتہ شکل قرار دیتے ہیں۔ وہ رجائیت پسندانہ انداز میں احیائے اسلام کے داعی اور مبشر ہیں۔ انھوں نے مغربی اندازِ فکر و تہذیب کی شدید کو تاہیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے ان سے گریز برتنے کی ہدایات دی ہیں۔ ان کی بشارت ہے کہ مسلمانانِ عالم کا احیاء ضرور ہو گا۔ اس ضمن میں وہ پیش گوئی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اے آبِ روانِ کبیر! تیرے کنارے کوئی
دیکھ رہا ہے کسی اور زمانے کے خواب
عالمِ نو ہے ابھی پردۂ تقدیر میں
میری نگاہوں میں ہے اس کی سحر بے حجاب
پردہ اٹھا دوں اگر چہرۂ افکار سے
لانہ سکے گا فرنگ میر ی نواؤں کی تاب
شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے[۴]

جدید علوم کی تمام تر بنیاد مظہر (Phenomenon) اور اضافیت کے ارتباط پر ہے۔ جب کہ پیغمبر انقلابؐ نے علم کے حصول و رسائی کے لیے جو دعا فرمائی اس کا مفہوم یہ ہے کہ اے اللہ مجھے اشیاء کی حقیقت کا علم (Noumenon) عطا کر دے۔ جدید سائنس ابھی تک بے پناہ ترقی کے باوجود Phenomenon کے مقام سے آگے نہیں بڑھی۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کو جن علوم کی رسائی کے لیے دعا کی ترغیب دی گئی ہے وہ مظہر (اشیاء جیسے دکھائی دیتی ہیں) کی بجائے حقیقتِ اشیاء کا علم (Noumenon) ہے۔ یعنی فکری اعتبار سے ملتِ اسلامیہ اس وقت بھی پیغمبر انقلابؐ کے ارشاداتِ عالیہ کی روشنی میں جدید ترین تناظر علمی کی حامل ہے۔ بقول اقبال:

مجھ کو بھی نظر آتی ہے یہ بو قلَمونی
وہ چاند، یہ تارا ہے، وہ پتھر، یہ نگیں ہے
دیتی ہے میری چشمِ بصیرت بھی یہ فتویٰ
وہ کوہ، یہ دریا ہے، وہ گردوں، یہ زمیں ہے
حق بات کو لیکن میں چھپا کر نہیں رکھتا
تو ہے، تجھے جو کچھ نظر آتا ہے، نہیں ہے[۵]

علامہ اقبال جدید تاریخ اسلام میں وہ عظیم نباضِ ملت ہیں کہ جنھوں نے مسلم امہ کے زوال کے اسباب، نتائج اور احیاء پر بنظرِ غائر روشنی ڈالی ہے اور ملتِ اسلامیہ کو اس کی کج فہمیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے احیاء و توقیر کی بحالی کے منہاج و اصول بھی بتائے ہیں۔ تحصیل و ترویجِ علوم کا درجہ ان میں سرِ عنوان آتا ہے۔

علامہ اقبال کی مساعی بسلسلہ تعلیم

علامہ اقبال ہمہ جہت و ہمہ گیر نوعیت کی شخصیت کے حامل تھے۔ ان کے شعری سرمائے اور نثری شہ پاروں کے مطالعے سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی نظر صرف فلسفہ تک محدود نہ تھی بلکہ دیگر درجہ علوم مثلاً طبعیات، حیاتیات، عمرانیات، اور نفسیات سمیت کئی دیگر علوم پر بھی وہ مکمل نگاہ رکھتے تھے۔ اس طرح اگر اقبالیات کو کثیر المضامینی، کثیر الجہتی مضمون (Multi-disciplinary subject) کہا جائے تو بے جانہ ہوگا۔ ان کے علمی و فکری سرمائے میں جا بجا ان مضامین کے موضوعات سے متعلق

متنوع مواد میسر آتا ہے۔ جہاں تک فلسفہ / تصورِ تعلیم کا تعلق ہے، علامہ اقبال نے عملاً اس میدان میں کام کیا ہے۔ جامعہ پنجاب، گورنمنٹ کالج لاہور، اسلامیہ کالج لاہور، اور لندن میں بھی ان کا باقاعدہ تعلق درس و تدریس اور تعلیم و تعلم سے رہا۔ ہندوستان سے یورپ تک تعلیمی سفر، دو مختلف نظم و طریق ہائے تعلیم و تدریس سے استفادہ نے علامہ اقبال پر جوہر خودی کی طرح جوہر تعلیم کی کئی جہتیں آشکارا کی ہیں۔ ان کے سفر افغانستان میں تعلیمی اصلاحات کا عمل بھی در آیا۔ جہاں انہوں نے درسی کتابوں کی باقاعدہ نصاب سازی کی۔ اسی طرح آئینہ عجم طبع اول ۱۹۲۷ء، یہ کتاب ثانوی (میٹرک) کے درجہ کے لیے فارسی نثر و شاعری پر مشتمل تھی۔ یہ علامہ کی وفات کے بعد بھی کئی برسوں تک نصاب میں شامل رہی۔ اسی طرح اردو کورس بہ اشتراک حکیم احمد شجاع کی کتابیں پانچویں، چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے لکھیں۔ یہ کتابیں بارہا شائع ہوئیں، پنجاب، یوپی، دہلی، مدراس وغیرہ کے سکولوں میں نصابی کتابوں کے طور پر پڑھائی جاتی رہیں۔[۶]

علامہ اقبال نے فلسفہ، مقاصد، ماہیتِ تعلیم اور علم کی مختلف شاخوں، علم و حکمت، فلسفہ علوم و فنون کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ خطبات میں خطبہ اول "علم اور مذہبی مشاہدات" کے عنوان سے لکھا ہے۔ جس میں جدید فلسفہ اور قرآن کے تناظر میں علم و معرفت کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی کی ہے۔ دیگر مضامین اور مقالات و شاعری میں انھوں نے غایتِ تعلیم، حصولِ علوم میں تخصیص، ادب اور دیگر علوم و فنون کی تحدید کو بھی واضح کیا ہے۔

مقصدِ تعلیم: علامہ اقبال کی نظر میں

علامہ اقبال نے تعلیم کے سلسلہ میں انسان کو ایک ایسے کل کی حیثیت سے جانچا کہ جس میں وہ کئی اجزاء پر مشتمل اپنی ذات میں ایک واحد غیر منقسم شے ہے۔ تعلیم میں ان تمام اجزاء کی ہمہ گیر نشو و نما کا پہلو شامل ہونا چاہیے۔ یہ اجزاء مل کر ایک دوسرے کو قوت و استحکام بخشتے ہیں۔ علامہ اقبال کے مطابق وہی طریق تعلیم کامل ہو گا جو نفس ناطقہ کے ان تمام اجزاء کی نشو و نما کا کام انجام دے گا۔ علامہ اقبال اس ضمن میں رقمطراز ہیں:

> ادراک، تخیل، تاثر اور مشیت، غرض کہ نفس ناطقہ کی ہر قوت تحریک میں آنی چاہیے۔ کیوں کہ کامل طریق تعلیم کا منشا یہ ہے کہ نفس ناطقہ کی پوشیدہ قوتیں کمال پذیر ہوں نہ یہ کہ بہت سی علمی باتیں دماغ میں جمع ہو جائیں۔[۷]

جدید تعلیمی نظریات اب اس بات تک پہنچ چکے ہیں کہ انسان میں بہت سے قوائے ناطقہ ہیں۔ ان قوائے ناطقہ ہی کی بدولت انسان مختلف النوع کی ذہانت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس نظریہ کو "Multiple intelligence theory(MIT)" کہا جاتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس سے اگلے پہلو کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے:

> نفس ناطقہ قواء کا ایک مجموعہ نہیں ہے بلکہ یہ اپنی ذات میں ایک واحد غیر منقسم شے ہے اور اس کی ہر ایک قوت کا نشوونما ہر دوسری قوت کی نشوونما پر منحصر ہے۔ جس طرح جسمانی اعضاء تناسب کے اصولوں کے مطابق بڑھتے ہیں اسی طرح نفسِ ناطقہ کی قواء کی نشوونما بھی انہی اصولوں کے تحت میں ہے۔[۸]

علامہ اقبال کے مطابق ذہانتوں / نفسی قواء کو علاحدہ سمجھتے ہوئے، ان کی نشوونما کا اہتمام کرنا عبث ہے۔ بلکہ انھیں بطور کل لیا جائے گا۔ یہ تمام قواء باہم دگر انحصار کر کے بڑھوتری کے عمل سے گزرتے ہیں۔ اس بنیادی اور اہم نقطے کی جانب توجہ مبذول ہونے سے نظام تعلیم میں کئی نئے افق تلاش کیے جا سکتے ہیں۔ کیوں کہ جدید تعلیمی نظریات ابھی ان قواء کے ارتباط کی طرف نہیں پلٹے۔ علامہ اقبال نے مقاصدِ تعلیم میں اس بات کو لازمی گردانا ہے کہ نفس ناطقہ کی پوشیدہ قوتوں کو کمال تک پہچانا لازمی ہے۔ وہ معلومات کے مجموعے کو تعلیم اور مقصدِ تعلیم سے خارج سمجھتے ہیں۔

تحصیلِ علم کے ذرائع

انسان کی تمام تر ترقی جو علمی و سائنسی اعتبار سے اس نے حاصل کی، کا انحصار حسی وادراکی علم پر ہے۔ یعنی محسوسات کے ذریعے علم کا حصول۔ انسان اعضائے حس کا استعمال کرتے ہوئے علم کو حاصل کرتا ہے۔ سائنسی تجربی علوم میں بالخصوص حسیات کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ وہ شے کہ جو احساسات و تجربات کے دائرے میں نہ آئے، تجربی علوم اس کا سرے سے انکار کر دیتے ہیں۔ اس طرح عصر حاضر کے تمام سائنسی علوم مظہری، حسیاتی، تجربی، اور اضافیت و باہمی اضداد کی بدولت پروان چڑھے ہیں۔ سائنسی علوم مظہر اور اضافیت کی پیداوار ہیں۔ جدید نفسیاتی تناظراتِ تفہیم اس بات کا اقرار کرتے ہیں کہ حسیات کا ادراک ہمیشہ درست نہیں ہو سکتا۔ یہ ادراک التباس (illusion) کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ اس طرح حقیقت تک رسائی کی بجائے انسان سرابوں میں گم رہتا ہے۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے دو طریقِ حصولِ علم بیان کیے ہیں۔ ایک وہ کہ جو حواس کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس طریقِ تحصیل میں حواسِ خمسہ کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شے احساسات کے حیطے میں نہ

آئے کیا اس کے وجود سے انکار ہی لازم ہے؟۔ علامہ کا اس حوالے سے جواب نفی میں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ حصول علم کا ایک اور ذریعہ "وجدان" (intuition) بھی ہے کہ جس کی بدولت حسیاتی علم سے زیادہ معتبر، یقینی اور کامل علم حاصل ہوتا ہے۔

علامہ اقبال دونوں طریق ہائے تحصیل کے قائل ہیں۔ وہ کسی طرح بھی ان کو متضاد قرار نہیں دیتے۔ ان کے نزدیک خارجی مظاہر کے ادراک کے لیے محسوسات اور داخلی وروحانی تجربات کے لیے وجدان کا طریقہ مستعمل ہو گا۔ جس طرح مدرکاتِ خارجیہ کے لیے اعضائے حس کا استعمال ہوتا ہے اسی طرح واجدانی طریقِ علم میں قلب / فواد استعمال ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کے مطابق قلب کو قوتِ دید حاصل ہے۔ اس کی اطلاعات کی، اگر صحت کے ساتھ تعبیر کی جائے تو وہ کبھی بھی غلط ثابت نہیں ہوتیں۔ یعنی علامہ اقبال وجدان کو بھی معروضی اور معروف اصطلاح میں سائنسی اصول پر استعمال میں لانے کے قائل ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ یہ طریقِ مشاہدہ بھی دوسرے مشاہداتی طریقوں کی طرح قابلِ اعتماد ہو گا۔[9]

"وجدان" سے متعلق علامہ اقبال کے اس طرزِ استدلال کی بدولت ایک تو حصول تعلیم کے بلند ترین تناظرات کی وضاحت ہوئی۔ اس وقت تک بھی سائنسدان اس حوالے سے تردیدی خیال کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک ماورائے حس ادراک(Extra sensory perception) سائنسی انداز تحقیق نہیں ہو سکتا۔ لیکن اب جدید نفسیات اس بات کی قائل ہو گئی ہے کہ ماورائے حِسی ادراک کی بدولت تحصیل علم نہ صرف ممکن ہے بلکہ یہ معتبر ذریعہ علم بھی ثابت ہو سکتا ہے۔ تاہم عملی اعتبار سے ابھی انتہائی قلیل ترین تعداد میں بھی افراد اس پہ تجربیت کے پہلو سے عمل نہیں کر سکے ہیں۔ لیکن جب اسے باقاعدہ طریق تحقیق کے طور پر لیا جائے گا تو لازماً بحر تخیل میں سے کئی نئے علمی جزیرے منصہ شہود پر آئیں گے۔

اس طریق سے مذہبی واردات ومشاہدات پر اٹھنے والے اعتراضات بھی ساقط ہوتے جائیں گے۔ کیوں کہ جب تک اس طریق پر سائنسی انداز و معیار کے مطابق عمل نہیں کیا جاتا تب تک شاید عینیت کے قائل حضرات تشکیک کے گڑھے سے باہر نہ آسکیں۔ علامہ اقبال نے قرآن کریم کی آیات بینات سے اس کی شرح کی ہے۔ ان کا اسلوب انتہائی پرُ اعتماد، سائنسی اور تجربی نوعیت کا معلوم ہوتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس عملِ وجدان سے کئی بار مشاہدات کے عمل سے گزر چکے ہیں۔ اس استدلال سے مذہب کے مابعد الطبیعاتی مسائل اور امکانات مذہب کے اثبات سے متعلق بھی دلائل وبراہین میسر آئے ہیں۔

اس طرح الحادی تجربی علوم کے لیے ایک بلند آہنگ آواز ایسی ضرور ہے کہ جو ان تمام اعتراضات کا مسکت جواب فراہم کر سکتی ہے کہ جو علوم جدیدہ کے علمبرداروں کے پیدا کردہ ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ علامہ اقبال ہی وہ عظیم شخصیت ہیں کہ جنھوں نے ملت کے بدترین ایام /کسمپرسی و غلامی میں بھی، دانشِ افرنگ کی چمک سے خیرہ ہوئے بغیر، معذرت خواہانہ لہجہ اختیار نہیں کیا اور نہ ہی وہ اپنے نظریات و موَقف کے استحضار میں کسی مصلحت کا شکار ہوئے ہیں۔ بلکہ انھوں نے بلاخوف تردید، علم و مذہبی مشاہدات کے ذیل میں ایسے تصورات کا پرچار کیا کہ جن پر ابھی تک تقریباً صدی بھر گزرنے کے بعد بھی باقاعدہ ترویج تو ممکن نہ ہوئی لیکن ان کے امکانات انتہائی واضح ہو چکے ہیں۔

اس ضمن میں یہ بات بھی بلا تامل قابلِ اقرار ہے کہ اگر دنیا میں ان تصوارتِ تحصیل علوم پر معروضی انداز میں تحقیق کی جائے تو یہ امر واضح اور لازم ہے کہ الحاد کی بساط لپیٹ دی جائے گی اور چمن نغمہ توحید سے لازماً معمور و مستنیر ہو جائے گا۔ علامہ اقبال اس طریق کی تطبیق حسیاتی طریق سے کرتے ہیں اور مذہبی واردات و تجربات کے لیے داخلی و خارجی عوامل کو یکساں اہم قرار دیتے ہیں۔ کیوں کہ قرآن کریم بھی انھیں انفس وآفاق کے دو گروہوں میں بیان کرتا ہے۔ جہاں انفس کا تعلق داخلی، نفسی ،ذاتی وروحانی علوم سے ہے جب کہ انسان کے سوا جو کچھ بھی خارجی مظاہر واجرام وغیرہ ہیں ان کو آفاق تصور کیا جاتا ہے۔ لہٰذا تبین حق کے لیے انفس و آفاق کی نشانیوں پر غور و فکر اور مشاہدہ کی تلقین کی گئی ہے۔ قران مجید نے انسان کی اختیاری روش کو اس کی روحانی زندگی کا ایک ناگزیر مرحلہ ٹھہرایا اور اس لیے محسوسات ومدرکات کے ہر عالم کو یکساں اہمیت دی کیوں کہ وہ حقیقت مطلقہ کے علم و ادراک کا، جس کی آیات ظاہر و باطن میں ہر کہیں موجود ہیں، ایک ذریعہ ہیں۔ ادراک بالحواس سے ان کا انکشاف ہوتا ہے۔ غور و فکر سے کام لیں اور یوں ان پر دسترس حاصل کرنے کی کوشش کریں۔[۱۰]

علامہ اقبال نے صاحبان علم و تحقیق و جستجو کے لیے ایک انتہائی بلند اور اہم ترین منہاج، وجدان کی جانب راہنمائی فرمائی ہے۔ اسی طرح آج تک جن دو طریقوں کو مخالف وباہم دگر سمجھا جاتا رہا ہے ان میں بفحوائے قرآن تطبیق و ارتباط پیدا کر کے انھیں معروضی انداز میں پیش کرنے کی بہترین سعی کی ہے۔ اس طرح مذہبی و تجربی علوم کی دوئی بھی ختم کی جا سکتی ہے۔

خودی، بے خودی کی تعمیر و حفاظت: اہم مقصد تعلیم

علامہ اقبال خودی کے پیامبر ہیں۔ ان کے مطابق خودی کی تعمیر و حفاظت ہی حاصلِ حیات ہے۔ وہ صدف زندگی کے اندر خودی کو قطرہ نیساں قرار دیتے ہیں۔ بقول علامہ محمد اقبال:

زندگانی ہے صدف قطرۂ نیساں ہے خودی
وہ صدف کیا کہ جو قطرے کو گہر کر نہ سکے
ہو اگر خود نگر و خود گر و خود گیر خودی
یہ بھی ممکن ہے کہ تو موت سے بھی مر نہ سکے"

علامہ اقبال نے زندگی کے گہر کی تابداری کے لیے خودی کی حفاظت لازم قرار دی ہے۔ اس طرح افراد اطاعت اور ضبطِ نفس کے نشانِ ہائے راہ سے ہوتے ہوئے نیابت الٰہی کی منزل تک پہنچنے کے قابل بن جاتے ہیں۔ عرفان ذات سے عرفان رب تک کا سفر بھی یہ آسانی طے ہوتا ہے۔ افراد کی تعمیر و استحکام و حفاظت خودی کی طرح، وہ قوم کی خودی (بے خودی) کے تسلسل، تربیت، استحکام و حفاظت پر بھی زور دیتے ہیں۔ جس طرح انفرادی خودی کے استحکام و حفاظت کے لیے شعوری کوشش کی جاتی ہے بالکل اسی طرح قومی خودی کے استحکام و نمو کا انحصار بھی شعوری کوشش پر ہے۔ تب کہیں افراد و ملت بلند ترین علمی مدارج و معرفتِ ربانی کے حصول کے قابل بنتے ہیں۔ وہ شعوری کوشش جو افرادِ ملت کی خودی کے استحکام و پرورش کے لیے سر انجام دی جائے، اسی کا دوسرا نام تعلیم ہے۔ تعلیم کے تعلق و تسلسل کی بدولت علوم پدری سے بہرہ ور ہو کر، ماضی کے تجربات کو مد نظر رکھتے ہوئے، انسان استقبال کی نئی راہیں تراش سکتا ہے۔ اگر ان اجتماعی روایات و وراثت پدری کو مؤثر طریقے سے آمدہ نسل تک نہ پہنچایا گیا تو افراد ملت کا اپنے مخصوص گروہ یعنی ملت سے پیوستہ رشتہ ختم ہو جائے گا۔ نتیجتاً نہ صرف ملت کا شیرازہ بکھر جائے گا بلکہ افراد کا ذاتی وجود بھی معدوم ہو جائے گا۔ دیباچہ مثنوی رموز بے خودی میں علامہ اقبال رقم طراز ہیں:

> جس طرح حیات افراد میں جلب منفعت، دفع مضرت، تعین عمل و ذوق، حقائق عالیہ، احساس نفس کے تدریجی نشو و نما، اس کے تسلسل، توسیع اور استحکام سے وابستہ ہے۔ اسی طرح ملل و اقوام کی حیات کا راز بھی اسی احساس یا بالفاظ دیگر "قومی انا" کی حفاظت، تربیت اور استحکام میں مضمر ہے۔ [۱۲]

انفرادی و قومی خودی کی تعمیر، استحکام، نمو و حفاظت کے حوالے سے علامہ اقبال کی توضیح یہ ہے کہ اگر کسی قوم کا نظام تعلیم ہی اس نوعیت کا ہو کہ جو خودی کی کسی ہیئت کے استحکام کا باعث نہ بنے تو پھر وہ نظام ناقص ہے۔ کیوں کہ جب وہ انفرادی و اجتماعی طور پر استحکام خودی کا باعث نہ ہو گا تو پھر رقابتِ ذاتی و قومی کا منفی رویہ جڑ پکڑے گا۔ جس کے نتیجے میں اقوام و ملل تباہی و بربادی کی جانب بڑھیں گیں۔ مخلوق خدا گروہ بندی اور تفرقوں کا شکار ہو جائے گی۔ وہ ذاتی حرص و لالچ کی خاطر کوئی بھی قبیح فعل بصورت

افراد و اجتماع، سر انجام دینے کی کوشش کریں گے۔ نتیجہ تباہی، ہلاکت و بربادی کے سوا اور کیا ہو گا؟ عصر حاضر میں بھی اگر دیکھا جائے تو اصل خرابی نظام تعلیم میں ہی واقع ہے کہ جس کی وجہ سے افراد و قوم کی تربیت بہتر اور انسانیت پسند انداز میں نہیں ہو رہی۔ اس طرح عہد حاضر میں علامہ کے افکار و نظریاتِ تعلیم پر عمل نجات کا باعث ہوں گے۔

مقصد تعلیم، علم کو تابع دین کرنا

علامہ اقبال کے نزدیک حسیاتی علم سے طبعی قوت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی حسیات کے استعمال سے جو علم میسر آتا ہے اس میں تسخیر کائنات و آفاق کا امر انجام دیا جاتا ہے۔ جیسے سائنس کا انحصار حسیاتی ادارک پر ہے۔ اس کی بدولت خارجی دنیا میں موجود اصولوں کو دریافت کر کے توانائیوں کو استعمال میں لایا جا رہا ہے۔ جس سے انسان کو بے پناہ طبعی قوت (Physical/Nuclear Energy) پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ اگر یہ علوم دین کے ماتحت نہ رہیں تو پھر یہ محض شیطانیت پر مبنی تماشا ہو گا۔ علامہ حسیاتی علوم کو علم حق کا آغاز سمجھتے ہیں۔ اس آغاز کے بعد وہ علم حق کی آخری منزل عشق کو قرار دیتے ہیں۔ علامہ اقبال، خواجہ غلام السیدین کے نام اپنے ایک خط میں جس کا پورا متن حاصل نہ ہونے کی وجہ سے تاریخ کا پتہ نہیں چل سکا، میں رقمطراز ہیں:

"علم حق اول حواس آخر حضور
آخر او می نگنجد در شعور

مسلمان کے لیے لازم ہے کہ علم کو (یعنی اس علم کو جس کا مدار حواس پر ہے اور جس سے بے پناہ قوت پیدا ہوتی ہے) مسلمان کرے۔ بولہب راحیدر کرار کن، اگر یہ ابو لہب حیدر کرار بن جائے یایوں کہیے کہ اگر اس کی قوت دین کے تابع ہو جائے تو نوع انسان کے لیے سراسر رحمت ہے۔"[۱۳]

علامہ کی اس وجدانی ہدایت کا راز آج منکشف ہو چکا ہے کہ علم حسیات کی بدولت انسان نے واقعی طبعی قوت کی بے پناہ کثرت پر غلبہ پالیا ہے۔ اس میں قوتِ حیات (Bioenergy) قوتِ ذرہ و مرکزہ (Atomic & Nuclear Energy) وغیرہ شامل ہیں۔ جدید انسان کی ان تابع کردہ قوتوں کے غلط استعمال کی بدولت یہ دنیائے کمتر کئی مرتبہ تباہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے علامہ اقبال کے مطابق اس علم کو دین کے تابع کرنا لازم تھا تا کہ تباہی و بربادی سے انسانیت محفوظ رہے۔ علامہ اقبال ایسی تعلیم کے خواہاں ہیں کہ جو افراد میں راہبری، خود اعتمادی، خود احتسابی اور خود نگینی کی صفات کو نمو دے سکے۔ ان کے مطابق اگر کوئی تعلیم خیال میں بلند پروازی، عمل میں تیز گامی، نظر میں گہرائی اور گیرائی پیدا کرنے سے

قاصر رہے تو ایسی تعلیم مسلمانوں کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام اقوام کے لیے بے کار محض ہے۔ بقول علامہ اقبال:

وہ علم کم بصری، جس میں ہم کنار نہیں
تجلیاتِ کلیم و مشاہداتِ حکیم[۱۴]

علامہ اقبال چاہتے ہیں کہ افراد ملت ایسی تعلیم سے بہرہ ور ہوں کہ جو فطرت کی طاقتوں پر غلبہ حاصل کر کے عالم انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے استعمال کر سکیں۔ وہ زندگی کے شعبے کو دین کے تابع رکھ کر ترقی کے حصول کی آرزو کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ایام زمانہ کی گردش پہ غالب آنے کا نسخہ یہ ہے کہ:

وہی زمانے کی گردش پہ غالب آتا ہے
جو ہر نفس سے کرے عمرِ جاوداں پیدا[۱۵]

جدید سائنسی علوم: اقبال کی نظر میں

علامہ اقبال نے حسیاتی علم کے حصول کو لازم گردانا ہے۔ ان کے مطابق جدید سائنس اور تسخیر کائنات ہم معنی ہیں۔ جدید سائنسی علوم کی بنیاد تین اصولوں پر ہے، جو مشاہدہ فطرت (Observation of natural phenomenon)، استقرائی طرز استدلال (Inductive method of reasoning) اور تجربی طریقہ تحقیق (Experimental System of research) پر مشتمل ہیں۔ علامہ اقبال سائنس کے ان بنیادی اصولوں کو قرآنی تعلیمات اور ارشادات نبویؐ سے ماخوذ قرار دیتے ہیں۔ سائنسی علوم کا انحصار حسیات پر ہے۔ یونانیوں کے برعکس اسلامی تعلیمات میں حسیات اور اس کے وظائف کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے۔ کئی آیات بینات میں تفکر، تدبر اور اعضائے حسیات کے استعمال کی دعوت دی گئی ہے۔ کئی آیاتِ قرآنیہ و احادیث رسولؐ میں سائنسی انداز فکر اور آیاتِ آفاق و انفس پر غور و فکر کی ترغیب دی گئی ہے۔ جدید سائنسی تناظرات اور طریق تحقیق انہی مبادی اصولوں کو مد نظر رکھے ہوئے ہیں۔ علامہ اقبال کے الفاظ میں:

> قرآن مجید نے سمع و بصر کا شمار اللہ تعالیٰ کے گراں قدر انعامات میں کیا اور عند اللہ اپنے اعمال و افعال کا جواب دہ ٹھہرایا۔[۱۶]

علامہ اقبال نے اس حوالے سے قرآن کریم کی کئی آیات، سورۃ البقرۃ آیت ۱۶۴، سورۃ الروم وغیرہ کا باقاعدہ حوالہ دیا ہے کہ تسخیر کائنات کی صریح وضاحت قرآن کریم میں موجود ہے۔وہ مزید رقمطراز ہیں:

ان آیات میں یہ نکتہ مضمر ہے کہ انسان کو تسمیہ اشیاء کی قدرت حاصل ہے یعنی وہ ان کے معانی قائم کر سکتا ہے اور معانی کا قائم کرنا گویا ان کو اپنے قابو میں لے آنا ہے۔[۱۷]

علامہ اقبال نے اپنے شعری و نثری سرمائے میں اس حوالے سے جابجا اظہار فرمایا ہے۔

اقبال کے تصور تعلیم میں مختلف مضامین کا درجہ

علامہ اقبال نے مضامین کی درجہ بندی کو بھی ملحوظ خاطر رکھا ہے ۔ ان کے نزدیک ماضی اور مستقبل سے تعلق رکھنے کی بنیاد پر علوم کی تحصیل کی جاسکتی ہے۔ماضی کے تجربات اور حال کے احوال و ظروف کو مد نظر رکھتے ہوئے استقبال کی بہتری کے لیے سعی کی جاسکتی ہے۔ان کے مطابق مضامین کو فلسفیانہ مضامین، ادبی، فنی مضامین (ادبیات و فنون لطیفہ)، تجربی و سائنسی علوم، مابعد الطبعیاتی علوم اور سماجی علوم میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔انھوں نے علم کی ہر قسم کو درجہ بدرجہ اہمیت دی ہے۔ان کے نظام تعلیم میں تمام مضامین کو ان کے نفس مضمون، مقاصد اور نظریہ کے تحت متناسب اہمیت حاصل ہے۔وہ دینی علوم کی تحصیل کو خودی کی تعمیر کے لیے لازم گردانتے ہیں۔دینی علوم کے بعد تاریخ علامہ اقبال کی نظر میں بے حد ضروری نوعِ علم ہے۔ان کے مطابق جو قومیں تاریخ سے بیگانگی اختیار کرتے ہیں وہ اپنی ہستی کو کھو بیٹھیں گی۔اس طرح ادب و فن کے مضمون کو بھی نافع تصور کرتے ہیں۔ لیکن اس حوالے سے وہ تحدید و مقصدیت کو پیش نظر رکھنا لازمی گردانتے ہیں۔[۱۸]

علامہ اقبال "جناب رسالت مآبؐ کا ادبی تبصرہ" کے عنوان سے مقالات میں دو عربی شعراء امرالقیس اور عنترہ کا موازنہ کرتے ہوئے حدیث رسولؐ کی روشنی میں بتاتے ہیں کہ حضور ﷺ نے فرمایا امراءالقیس شاعروں کا سرتاج تو ہے ہی لیکن جہنم کے مرحلے میں ان سب کا سپہ سالار بھی ہے جب کہ عنترہ کے بارے میں فرمایا کہ اللہ کے رسولؐ کا دل چاہتا ہے کہ عنترہ سے ملیں۔دونوں مشرکین شعراء کے بارے میں دو مختلف آراء اس بات کی غماز ہیں کہ امراءلقیس کی شاعری قواء کو ضعف پہنچاتی اور سفلی و شہوانی جذبات کو ابھارتی تھی جب کہ عنترہ کے اشعار اکل حلال اور زندگی کی حقیقتوں سے آشنا کرتے تھے۔سو معلوم ہوا کہ وہ ادب جو زندگی کی ناہمواریوں میں ہمت و حوصلہ اور جرات و ثابت قدمی کا

درس دے، یعنی ادب برائے زندگی کے نظریے کا حامل ہو وہ صائب اور بہتر ہے جب کہ بصورت دیگر قبیح و قابلِ مواخذہ ہے۔[19]

بقول اقبال:

شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا[20]

اسی طرح علامہ اقبال اس علم و ادب کے بھی خلاف تھے جس سے پست ہمتی، ناخود شناسی، مایوسی اور ناامیدی پیدا ہو۔ اس ضمن میں علامہ کا شعر:

ہے شعر عجم اگرچہ طربناک و دلآویز
اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز[21]

علامہ اقبال مذہبی تعلیمات کے حصول کے حق میں تھے۔ اسی طرح مابعد الطبعیات کے مطالعے کے حوالے سے ان کا خاص خیال تھا کہ سائنس اپنے کئی تصورات پر بلاواسطہ مابعد الطبعیات پر انحصار کرتی ہے ۔ ان کا کہنا تھا کہ سائنس کو مابعد الطبعیات پر خندہ زن نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ لیبنز(Leibniz)(جرمنی کا مشہور فلسفی و ریاضی دان)وہ ماہر مابعد الطبعیات ہی تھا کہ جس نے سب سے پہلے سائنس کو مادے کا عملی تصور بخشا۔ اس کا کہنا ہے کہ مادہ اصلاً قوت مزاحمت ہے۔ سائنس نے یہ تصور مابعد الطبعیات سے مستعار لیا۔ سائنس خود اس تصور کو دریافت نہیں کر سکی۔[22] علامہ اقبال نے ڈرامے اور تھیٹر کے فن کی مخالفت کی ہے ۔ اسی طرح وہ افسانوی ادب کی بھی مخالفت کرتے ہیں کیوں کہ ان میں حقائق کی جانب توجہ نہیں ہوتی۔ جب کہ فنون لطیفہ، فن تعمیر، موسیقی، مصوری ماسوائے مجسمہ سازی اقبال کے ہاں مناسب مضامین ہیں۔[23]

تعلیم نسواں

علامہ اقبال کے نزدیک خواتین کے لیے بھی تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے مگر یہ تعلیم ایسی نہیں ہونی چاہیے کہ جو عورت کو اس کے فطری فرائض سے غافل کر دے۔ علامہ اقبال نے اپنے قیام یورپ کے دوران دیکھا کہ سائنس کی بے تحاشا ترقی کی بدولت اور مغربی تعلیم کی وجہ سے عورت اپنے فرائض سے روگردانی کرنے لگی ہے ۔ درحقیقت نئی نسل کی تخلیق اور تعلیم و تربیت کے اتنے بڑے فریضے سے روگردانی قومی خودکشی کے مترادف تصور ہوگا۔ مغربی تعلیم کے اس تیزاب کی بدولت ان کی خودی

زائل ہو چکی ہے۔ بطور تہذیب ان میں خاندانی نظام کی ٹوٹ پھوٹ کی بدولت انتہائی فکری و عملی زبوں حالی، نفسیاتی مسائل کی بھرمار، بے اطمینانی اور تحلیل ذہنی (Schizophrenia) کی کیفیات پیدا ہو چکی ہیں۔ اس کی اساسی وجہ طریق تعلیم اور تعلیم نسواں میں خرابی ہے۔ عورت کا یہ کمال نہیں گردانا جاسکتا کہ وہ علم و فضل میں ارسطو و افلاطون کی مقابل بن جائے بلکہ یہ اصلی کمال سمجھا جاتا ہے کہ وہ ارسطو اور افلاطون پیدا کرے۔ علامہ اقبال نے اس حوالے سے اس طرح اظہار فرمایا ہے:

تہذیبِ فرنگی ہے اگر مرگِ امومت
ہے حضرتِ انساں کے لیے اس کا ثمر موت
جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن
کہتے ہیں اسی علم کو اربابِ نظر موت
بیگانہ رہے دیں سے اگر مدرسہِ زن
ہے عشق و محبت کے لیے علم و ہنر موت[۲۴]

علامہ اقبال ایسی تحصیل علم کو موت تصور کرتے ہیں کہ جس کی بدولت اسلامی تعلیمات سے وہ صرفِ نظر برتیں۔ جس علم سے عورت اپنے فطری فرض اور میدان سے بُعد اختیار کر لے وہ اس کے لیے ہی نہیں بلکہ پوری قوم وملت کے لیے سم قاتل ثابت ہوتا ہے۔ اسی طرح علامہ اقبال ایسی تعلیم کے بھی حق میں نہیں کہ جو خود شکنی کی تعلیم دے۔ جس کی وجہ سے انسانی وجود کی کامل صلاحیتوں اور جسم و روح کی ضرورتوں کی تکمیل ممکن نہ ہو۔ جدید نظام تعلیم کی وجہ سے نئی نسل کے ظاہر و باطن، عقل و روح اور علم و عقیدہ کے درمیان ایک وسیع خلیج پیدا ہو گئی ہے اور اس کی شخصیت مسخ ہو کر رہ گئی ہے۔ اس طرز تعلیم سے اگر انھیں بادشاہی بھی نصیب ہو تو وہ بے سود ہے۔ علامہ اقبال کا کہنا ہے کہ میں نے فرنگی و جدید تہذیب میں کہیں بھی حیات بخش نظریات کو نہیں پایا کہ جن کی بدولت فقر حیدری اور استغنائے سلیمانی کا حصول ممکن ہو۔ اس ضمن میں لکھتے ہیں:

امارت کیا، شکوہ خسروی بھی ہو تو کیا حاصل
نہ زورِ حیدری تجھ میں، نہ استغنائے سلیمانی
نہ ڈھونڈ اس چیز کو تہذیبِ حاضر کی تجلی میں
کہ پایا میں نے استغناء میں معراجِ مسلمانی[۲۵]

مغربی تعلیم: علامہ اقبال کی نظر میں

علامہ اقبال ان چند خوش قسمت افراد میں سے شاید سر فہرست ہیں کہ جنھوں نے مغربی تعلیم سے اخذ و اکتساب بھی کیا لیکن اس کے باوجود اس کی تباہ کاریوں، مضمراتِ قبیحہ سے سلامت واپس نکلے۔ دانش افرنگ کا جلوہ ان کی بصارتِ چشم و بصیرتِ قلب کو خیرہ نہ کر سکا۔ بلکہ وہ مغربی تعلیمی استعمار کی یلغار میں مزید مسلمانی طرز وروش کے ساتھ سامنے آئے بقول اقبال کہ انھیں مغرب نے مسلماں سے مسلماں تر کر دیا۔ تہذیب مغرب کے افکار و نظریات کی آگ میں وہ کڑے امتحاں میں مبتلا ہوئے لیکن ان کا ماننا ہے کہ وہ اس امتحاں میں بھی مثل خلیلؑ سلامت رہے۔ وہ نہ صرف اس سے سلامت بچ نکلے بلکہ انھوں نے اس فکری استیلاء اور اس کی تباہ کاریوں سے متعلق واضح اور مبین انداز میں ملت کو بتایا کہ تہذیب و تعلیمِ مغرب کس زہر کو لیے پھرتی ہے اور اس کا تریاق کیا ہو گا۔ انھوں نے بتایا کہ اس تعلیم کی وجہ سے بے اعتدالی، ضعف اعتقادی، ناپختہ افکار کی یلغار، دل و دماغ کی ناآسودگی، جسم و روح کی دوئی، کم ہمتی، مے خواری، عریانی اور افلاسِ فکر و جسم جیسی قبیح عادات جنم لیتی ہیں۔ بقول علامہ اقبال:

بے کاری و مے خواری و عریانی و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کی فتوحات[۲۶]

علامہ اقبال مغربی درسگاہوں اور نظام تعلیم کو مسلمانوں کی ذہنی و ملی روایت کے منافی قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مکتب کا جوان زندہ لاش کی صورت ہے کہ جس میں ذہنی و ملی روح کی جگہ فرنگی نفس نے لے لی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مغرب نے اب یہ راز ملوکانہ پایا ہے کہ انھیں یعنی مسلمانوں کو تیغوں سے زیر کرنے کی بجائے ایسا نظام تعلیم دو کہ اس کی خودی اس طرح زائل و ختم ہو جائے کہ جس طرح تیزاب کسی شے کو جلا کر راکھ کر دیتا ہے۔ پھر اس دیو قامت و قومی ہیکل ملت کی حیثیت مٹی کے ڈھیر سے زیادہ نہ ہو گی۔ اس کو علامہ نے اس طرح بیان کیا ہے:

تاثیر میں اکسیر سے بڑھ کر ہے یہ تیزاب
سونے کا ہمالہ ہو تو مٹی کا ہے اک ڈھیر[۲۷]

ان کا کہنا ہے کہ مغربی نظام تعلیم نے حصول علم کے حقیقی مقاصد کو بھی مجروح کر دیا ہے۔ اس تعلیم کی غرض و غایت معاشی دائرہ کے گرد گھومتی ہے جب کہ یہ اصل مقصد تعلیم نہیں ہونا چاہیے۔ کیوں کہ یہ انداز فکر انسان کو دو کفِ جو تک محدود کر دیتا ہے۔ مردانِ حر کے لیے یہ تصور زہر ہلاہل

ثابت ہو گا۔ انھوں نے مغربی تعلیم کے اس اندیشہ کی بھی وضاحت کی ہے کہ یہ عقل کو آزادی کا نعرہ دے کر خیالات کو بغیرِ نظم وبے ربط چھوڑ جاتا ہے۔ اس کے لادینی افکار سے مغرب میں تصور عشق مردہ ہو چکا ہے اور عشق و عقل اپنے افکار کی بے ربطگی کی وجہ سے مشرق میں غلامانہ حیثیت اختیار کر چکی ہے۔ اس کا سدباب اس طرح کیا جائے کہ مغرب کو روایت عشق کا قائل اور مشرق کو نظمِ افکار پہ مائل کرنا ضروری ہو گا۔ مغربی تعلیم کی وجہ سے کفر و الحاد کا دائرہ بھی بڑھتا گیا ہے۔ علامہ کا کہنا ہے کہ مغرب نے ایک خاص نظر اور تعصب کے تناظر میں مذہب سے بیزاری کا اعلان کیا اور اسے کبھی توہمات تو کبھی افیون قرار دیا ہے۔ مسلم ملت کے افراد بھی اسی نقالی کا شکار ہونے لگے۔ حالاں کہ حق تو یہ تھا کہ مذہب کا بھی معروضی انداز فکر و نظر سے مطالعہ و مشاہدہ کرنے کے بعد حتمی رائے قائم کی جاتی۔ علامہ فرنگی تعلیم کو دین کے خلاف سازش قرار دیتے ہیں:

ہم سمجھتے تھے کہ لائے گی فراغت تعلیم
کیا خبر تھی کہ چلا آئے گا الحاد بھی ساتھ
اور یہ اہلِ کلیسا کا نظامِ تعلیم
ایک سازش ہے فقط، دین و مروت کے خلاف[۲۸]

اپنے معروف خطبہ، ملت بیضا پر ایک عمرانی نظر، میں علامہ اقبال نے تعلیم جدید اور اس کے اتباع پر کھری تنقید کی ہے۔ علامہ کے الفاظ میں:

> اگر ہم اپنے تعلیمی کارناموں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگائیں تو معلوم ہو گا کہ موجودہ نسل کا نوجوان مسلمان قومی سیرت کے اسالیب کے لحاظ سے ایک بالکل نئے اسلوب کا ماحصل ہے کہ جس کی عقلی زندگی کی تصویر کا پردہ اسلامی تہذیب کا پردہ نہیں ہے۔ حالاں کہ اسلامی تہذیب کے بغیر میری رائے میں وہ صرف نیم مسلمان بلکہ اس سے بھی کچھ کم ہے۔[۲۹]

اسلامی دارالعلوم کا قیام: علامہ اقبال کی خواہش

علامہ اقبال چاہتے تھے کہ ایک ایسے دارالعلوم کا قیام عمل میں لایا جائے کہ جہاں فکر اسلامی کی تشکیل نو کا کام سرانجام دیا جائے۔ انھوں نے اس حوالے سے جامعہ ازہر کے شیخ علامہ مصطفیٰ المراغی کو خط لکھا کہ جامعہ ازہر سے کسی عالم کو بھیجا جائے جو اسلامی علوم، علوم جدیدہ اور انگریزی پر کامل دسترس رکھتا ہو۔ تاکہ مجوزہ ادارے میں وہ اپنی گراں قدر خدمات سرانجام دے سکے۔ علامہ اقبال کے دیرینہ

ساتھی چودھری نیاز علی خان نے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے پنجاب پٹھانکوٹ جمال پور میں اپنی جائیداد و زمین میں سے کافی حصہ وقف کر دیا۔ یکم مارچ 1938ء میں اس کے اغراض و مقاصد طے پائے۔ اس ادارے کا نام دارالاسلام رکھا گیا تھا۔ لیکن اس کے فوراً بعد علامہ اقبال کا سانحہ ارتحال پیش آیا۔ اس طرح یہ منصوبہ علامہ اقبال کی زندگی میں شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔ بعد ازاں اس پر مزید کام بھی ہوا لیکن ہئیت اجتماعی کی صورت میں اس پر کام نہیں ہو سکا۔

علامہ اقبال کے تصورِ تعلیم کی عصری معنویت و اہمیت

علامہ اقبال شاعرِ فردا اور نباض و حکیم الامت ہیں۔ ان کی دور بین اور بصیرت افروز نگاہ نے مسلم امہ کے استقبالی تناظرات کی علول و منہاج کی جانب راہ نمائی فرمائی۔ ان میں سے اہم ترین پہلو رزم گاہ تعلیم ہے۔ علامہ کے تعلیمی تصورات ہمہ پہلو عصری تعلیمی مسائل کا شافی حل تجویز کرتے ہیں۔ علامہ کی بصیرت افروز نگاہ نے نہ صرف حال بل کہ استقبالی تناظرات تعلیم کا خاکہ بھی اپنے علمی و فکری سرمائے میں پیش کیا ہے۔ شعبہ تعلیم میں ان کی عملی مساعی اس امر کی بین شاہد ہیں۔ اس طرح مسلم امہ ان کے تعلیمی تصورات پر عمل پیرا ہو کر اقوامِ عالم میں بلند ترین مقام حاصل کر سکتی ہے۔ تاہم اس ضمن میں با قاعدہ تحقیق و تدقیق کے منہاج پہ گامزن ہونا لازم ہے۔

ماحصل

علامہ اقبال کے تعلیمی افکار تعمقِ فکر و نظر کے اعتبار سے دیگر افکار و نظریات کی طرح ہنوز اپنی عصری معنویت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ عصر مابعد جدید کے بعد بھی ان کی استخراجِ نظر، افکارِ تازہ معلوم ہوتے ہیں۔ ملت اسلامیہ گوناں گوں مسائل کا شکار ہے۔ ترجیحاتِ مسائل میں تعلیمی قضیہ سرِ فہرست آتا ہے۔ علمی میدان میں کامیابی دیگر نظم ہائے حیات میں سربلندی کی ضامن ہوتی ہے۔ علامہ اقبال نے نباض و حکیمِ ملت کے طور پر تعلیمی مسائل پر اپنے افکار و نظریات شرح وبسط کے ساتھ نظم و نثر میں بیان فرمائے ہیں۔ زیر نظر مقالے میں علامہ اقبال کے تعلیمی افکار اور جدید سائنسی علوم کو تحقیقی و تجزیاتی انداز میں زیر بحث لاتے ہوئے حاصلاتِ فکر کا اجمالاً احاطہ کیا گیا ہے۔ علامہ اقبال کے تعلیمی افکار کے مطابق اگر افرادِ ملت کے تعلیمی نظام کو استوار کیا جائے تو درج ذیل نتائج کا حصول ممکن ہو گا۔

- ملت قدامت پسندی، تنگ نظری، تقلید اور جمود کی تاریکی سے جدت، وسعت فکر و نظر، اجتہاد و تحرک جیسے انقلاب انگیز اور حیات افروز نظم ہائے تحصیلِ علوم سے آشنا ہو گی۔

- اختراع و ایجادات کی دنیا میں آگے بڑھتے ہوئے اقوامِ عالم میں اپنے کھوئے ہوئے مقام کو پلٹ سکیں گے۔
- مظاہر (Phenomena) سے حقیقتِ اشیاء (Noumena/Reality of things) تک پہنچنے کے سفر کا آغاز ہو گا۔ جس کی بدولت سائنسی و دیگر علوم میں کئی نئی علمی جہات کا در وا ہو گا۔
- عصر حاضر کے علمی و فکری افراط و تفریط کے خرابے میں، فکر اقبال کی روشنی میں، اصل اور حقیقی منبع و سرچشمۂ علم و حکمت کا عرفان عطا ہو گا۔

***

حوالہ جات و حواشی

۱ محمد اقبال، علامہ: کلیات اقبال (اردو)، (لاہور: اقبال اکادمی، اشاعت دوم، س ن) ص ۳۷۹

۲ ایضاً ص ۵۵۰

۳ ایضاً ص ۵۵۰

۴ ایضاً، ص ۴۲۷، ۴۲۸۲

۵ ایضاً، ص ۵۵۰

۶ ہاشمی، رفیع الدین، اقبال- سوانح اور افکار، (لاہور: یونیورسٹی آف منیجمنٹ اینڈ ٹیکنالوجی، طبع اول ۲۰۱۶ء) ص ۶۸، ۳۸

۷ معینی، عبدالواحد، مقالات اقبال، (لاہور: القمر انٹرپرائزز ۲۰۱۱ء) ص ۴۲۲

۸ ایضاً، ص ۴۲

۹ محمد اقبال، تشکیل جدید، ص ۵۲-۵۳

۱۰ ایضاً ص ۵۲

۱۱ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو) ص ۵۴۳

۱۲ معینی، عبدالواحد، مقالات اقبال، ص ۲۳۳

۱۳ برنی، مظفر حسین، کلیات مکاتیب اقبال، جلد چہارم (جہلم: بک کارنر، فروری ۲۰۱۶ء) ص ۳۴۴-۳۴۵

۱۴ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۵۳۸

---

۱۵ ایضاً، ص ۶۱۳

۱۶ محمد اقبال، تشکیل جدید، ص ۴۰

۱۷ ایضاً، ص ۵۰

۱۸ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، طیف اقبال، مرتب ڈاکٹر ممتاز منگلوری (لاہور: اقبال اکیڈمی ۲۰۰۹ء) ص ۱۳۷–۱۴۰

۱۹ معینی، عبد الواحد، مقالات اقبال، ص ۲۲۹–۲۳۲

۲۰ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو)، ص ۶۳۱

۲۱ ایضاً، ص ۲۳۲

۲۲ جاوید اقبال، ڈاکٹر، شذرات فکر اقبال، مترجم ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی (لاہور: مجلس ترقی ادب، طبع اول س ن) ص ۶۷۹

۲۳ سید عبد اللہ، ڈاکٹر، طیف اقبال، ص ۱۴۲–۱۴۴

۲۴ محمد اقبال، کلیات اقبال (اردو) ص ۶۰۸

۲۵ ایضاً، ص ۲۹۱

۲۶ ایضاً، ص ۴۳۵

۲۷ ایضاً، ص ۲۳۲

۲۸ ایضاً، ص ۲۳۲

۲۹ معینی، عبد الواحد، مقالات اقبال، ص ۱۷۲